ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.1 2023

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں شہری سماج کا موضوعاتی و کرداری مطالعہ

ڈاکٹر محمد سلیمان، لیکچرار شعبہ اُردو، اسلامیہ کالج پشاور
ڈاکٹر شہاب الدین، لیکچرار شعبہ اردو، اسلامیہ کالج پشاور
ڈاکٹر تقویم الحق، لیکچرار شعبہ اردو، اسلامیہ کالج پشاور

ABSTRACT

Ahmad Nadeem Qasmi is one of the famous and top writers of Urdu literature. He was an excellent poet, fiction writer, columnist and a reliable critic at the same time. Nature had blessed him with creative and critical talents with great equanimity and generosity. Be it poetry or fiction, he was not an artist content with limited and specific themes. They have all the colors of life with all their gaieties and sparkles. Urdu prose and poetry, his art and thought and creative excellence are favored. Most of the critics and analysts have focused their eyes on the villages and rural problems in his short stories, but in his fictions, the chaotic environment of the cities, hypocritical behavior, materialism, hypocrisy in love, misanthropy, sexual immorality, bribery, violation of the sanctity of relationships, fashionism, alcoholism, corruption and misdeeds.Ahmad Nadeem Qasmi's pen was not limited to rural life and rural characters, but his sensitive nature and creative mind also influenced by the city life. In the city, where they find artificiality, fabrication, hypocrisy, unnecessary appearance and display, stench behind clean faces, wounded souls under silk clothes, materialism, deceit and deception in the name of friendship, love and relationships, and especially of man and humanity. In this research article, the above-mentioned points are discussed with relevant examples.

Key Words: *Ahmad Nadeem Qasmi, Short stories, Rural Life, Urban Life, Hypocritical Behaviour, Materialism, Sanctity of relationships.*

کلیدی الفاظ: احمد ندیم قاسمی، افسانہ، دیہی زندگی، شہری زندگی، منافقانہ رویے، مادہ پرستی، رشتوں کا تقدس

احمد ندیم قاسمی کا شمار اردو ادب کے نامور اور چوٹی کے ادبا میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک بہترین شاعر، افسانہ نگار، کالم نگار اور معتبر نقاد تھے۔ قدرت نے ان کو بڑی یکسوئی اور سخاوت کے ساتھ تخلیقی و تنقیدی کمالات سے نوازا تھا۔ شاعری ہو یا افسانہ نگاری وہ محدود اور مخصوص موضوعات پر قناعت کرنے والے فنکار نہیں تھے۔ ان کے ہاں زندگی کے تمام رنگ اپنی تمام تر شوخیوں اور چمک دمک کے ساتھ موجود ہیں۔ اردو نثر اور شاعری، ان کے فن و فکر اور تخلیقی کمالات کی احسان مند ہیں۔

اظہر رضوی ان کی اس توانا اور خداداد صلاحیت کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اردو ادب میں کسی بڑے شاعر نے بڑی کہانیاں نہیں لکھیں اور کوئی قصہ نویس بڑا شاعر نہیں بن سکا۔ احمد ندیم قاسمی اردو ادب کی تاریخ میں اولین شخصیت ہیں جنھوں نے ہر دو اصناف میں یکساں قدرت اور یکساں شہرت حاصل کی۔ یہ بذات خود ایک ایسا مرتبہ، ایک ایسی توقیر ہے جس میں صرف قاسمی صاحب کو نوازا گیا ہے۔"(۱)

افسانوی دنیا میں احمد ندیم قاسمی پر دو چھاپ بڑے نمایاں ہیں۔ ترقی پسندی اور دیہاتی زندگی کی عکاسی۔ اکثر ناقدین اور تجزیہ نگاروں نے ان کی کہانیوں میں دیہات اور دیہاتی مسائل پر اپنی نظریں مرکوز رکھیں لیکن ان کے افسانوں میں شہروں کا پراگندہ ماحول، منافقانہ رویے، مادہ پرستی، محبت میں منافقت، انسان دشمنی، جنسی بے راہ روی، رشوت خوری، رشتوں کے تقدس کی پامالی، فیشن پرستی، شراب نوشی، کرپشن اور

بدعنوانیوں پر اپنی نظریں کم ہی مرکوز کی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کا قلم دیہی زندگی اور دیہی کرداروں تک محدود نہ تھا بلکہ ان کی حساس طبیعت اور تخلیقی ذہن کو شہر کی گونا گوں زندگی نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ شہر میں جہاں ان کو تصنع، بناوٹ، ریاکاری، بے جا نمود و نمائش، مصفیٰ چہروں کے پیچھے تعفن، لباس حریر کے نیچے زخمی روحیں، مادہ پرستی، دوستی، محبت اور رشتوں کے نام پر دھوکہ و فریب اور خصوصاً انسان اور انسانیت کی کم مائیگی نظر آئی تو وہاں ان کا قلم پکار پکار کے ہمیں جھنجھوڑتا ہے۔ شہر کے ہر چھوٹے بڑے برے کردار و افعال سے ان کو شدید قسم کی بے زاری اور شکوہ ہے۔ وہاں کی مادیت پرستی اور انسانیت سوز مناظر سے ان کو گھن آتی ہے۔

وجاہت مسعود اپنے مضمون 'ابر بہار چل دیا' میں انتظار حسین کا تبصرہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ندیم صاحب نے شہری زندگی پر قلم اٹھایا لیکن ان کی تحریروں میں حکایتِ دروں کی بجائے اکتساب کی سی کیفیت ہے، جیسے کوئی باریش دین دار فلمی دنیا پر تبصرہ لکھے۔"(۲)

احمد ندیم قاسمی کے ہاں ایسی بہت ساری کہانیاں ہیں جس میں انھوں نے شہری ماحول اور کرداروں کا باریک بینی سے مشاہدہ کر کے ان کے ظاہر و باطن کو یکساں طور پر آشکارا کیا ہے۔

افسانہ 'حدِ فاضل' پر اگرچہ ترقی پسندی کی چھاپ نمایاں ہے لیکن ساتھ میں یہ شہر کی خود غرضی اور جنس زدہ ماحول بھی دکھا رہا ہے۔ افسانہ نگار بتانا چاہتا ہے کہ شہری سماج میں جنس اور محبت آپس میں گڈمڈ سے ہو گئے ہیں۔ کہانی میں ملازمہ کا کردار ادا کرنے والی بلقیس اپنی مالکن کی محبت پر دھوکہ سے ڈاکہ ڈال لیتی ہے۔ وہ اپنے محبوب (مسعود) کو اس امید پر اپنے جسم کے سارے نشے حوالہ کر دیتی ہے کہ کل کو وہ مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا لے گا۔ بلقیس جوان اور کنواری لڑکی ہے۔ وہ مفلس ضرور ہے لیکن سینے میں جوان اور امنگوں بھرا دل رکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے دل و جان سے چاہے۔ اسے اپنے آغوش میں لے کر محبت کرے، پیار کرے۔ اسی لیے تو وہ اپنی سب سے قیمتی متاع مسعود کو سونپ دیتی ہے۔ محبت میں اپنا سب کچھ نچھاور کرنے والی ایسی لڑکیوں کی نفسیات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"آپ ایک ایسی لڑکی کو لیں جس کی پاکبازی کی قسم چاند ستارے کھا سکیں جس کے دامن پر فرشتے نماز ادا کریں۔۔۔ وہ لڑکی جب کسی مرد کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔۔۔ وہ ذہنی لحاظ سے اس حالت کو پہنچ جاتی ہے کہ ایک دن وہ اپنا اچھوتا شباب اور بے داغ جسم بارضا و رغبت بلا کسی تاسف یا اظہار پشیمانی اپنے محبوب کو سونپ دیتی ہے۔۔۔ اس مرد کی محبت کے احسان تلے دبی وہ اپنی دانست میں اسے سب سے قیمتی تحفہ پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہے۔"(۳)

بلقیس اپنی دانست میں اپنا بے داغ شباب مسعود کے حوالے تو کر دیتی ہے لیکن وہ شاید یہ بھول گئی تھی کہ ٹکڑوں پر پلنے والی کی اتنی توقیر اور وقعت نہیں ہوتی کہ اسے دل اور گھر میں جگہ دی جائے۔ اسے ٹشو پیپر سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی اور استعمال کے بعد پھینک دیا جاتا ہے۔

کہانی کا دوسرا کردار مسعود جو ایک دل پھینک عاشق اور جنس زدہ انسان ہے۔ جب پہلی بار بلقیس چاول لے کر اس کے گھر آتی ہے ت وہ اپنے ملازم کو چھٹیوں پر گاؤں بھیج دیتا ہے جس سے قاری سمجھ جاتا ہے کہ دال میں کچھ کالا کالا نہیں، پوری دال ہی کالی ہے۔ وہ بیچاری بلقیس کے جسم کو پانچ ماہ تک پیار کرنے، سہلانے اور ٹٹولنے کے بعد بھاری پیٹ کا تحفہ دے کر چلتا کر دیتا ہے۔ مسعود کا دوغلا پن اور منافقت ملاحظہ ہو کہ وہ محبت کی نظریں مرکوز کر رہا ہے بلقیس کی مالکن پر، اور جنسی سیرابی پا رہا ہے بلقیس سے، اور شادی کرنا چاہتا ہے اپنے والدین کی پسند کی لڑکی سے۔ دراصل مسعود جیسے کرداروں کی وجہ سے ہی محبت کا دامن داغدار اور چھلنی ہو جاتا ہے۔ محبت اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ ایسے ہی جنس پرستوں کی وجہ سے سماج

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.1 2023

میں انار کی، انتشار اور جنسی بخار پھیلتا ہے اور بلقیس جیسی عورتیں خودکشی کر لیتی ہیں یا طوائف بن جاتی ہیں۔

افسانہ 'سناٹا' اگرچہ کلی طور پر شہر کی بے آسرا عورتوں کے گھریلو اور ذہنی و نفسیاتی مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے لیکن بباطن یہ شہر کی ان لڑکیوں کی نفسیاتی اور ذہنی ہیجانات کی کہانی ہے جن کی شادیاں ان گنت مجبوریوں اور مسائل کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے ایسی محرومیوں کی شکار ہو جاتی ہیں جن سے مرتے دم تک وہ خود کو نکال نہیں سکتیں۔

ارشاد احمد اپنی ماں اور بہنوں کا واحد کفیل ہونے کے باوجود زن مرید بن کر اپنے خونی رشتوں کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ خاندان کی کفالت کا بار کلثوم کے ناتواں کندھوں پر آ پڑتا ہے۔ ماں اسے 'مرد بیٹی' کہہ کر اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ کلثوم کے لیے رشتے پہ رشتے آ کر ٹوٹتے ہیں کیونکہ ماں نے گھر داماد بننے کی شرط رکھی ہوتی ہے، جس سے کلثوم کے جذبات و احساسات اور خواہشات ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں اور جب ایک دن جمال گھر داماد بننے کی شرط کے لیے ہامی بھر لیتا ہے تو ماں اور بہن اسے یہ مژدہ سناتی ہیں لیکن وہ شادی سے انکار کر دیتی ہے۔

> "جمال سے بھی؟ ماں نے جیسے واسطہ دیتے ہوئے پوچھا۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ کلثوم کی آواز غیر معمولی طور پر بھاری اور گونجیلی ہو رہی تھی۔۔۔ میں جمال سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔۔۔ کیوں؟ اماں نے اب غصے سے پوچھا۔۔۔ اور کلثوم نے اپنے اوپر کے ہونٹ والے روئیں چھو کر کہا، میں مرد بن چکی ہوں۔۔۔ اور پھر بڑی بے پروائی سے انگلی اٹھا کر ہوا میں دستخط کرنے لگی۔"(۴)

کلثوم کی زندگی کے تمام نشیب و فراز محرومیوں اور ذہنی و اعصابی خلل میں ماں کی ڈانٹ ڈپٹ، حکم پہ حکم، مرد بیٹی کی رٹ، اکیلے گھر کی کفالت، بھائی کی جدائی اور شادی کی تمنا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کہانی میں رشتوں کے تقدس کی پامالی، خود غرضی اور مادہ پرستی کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر ماں اور اس کی باقی بیٹیاں گھر کی چار دیواری میں دستکاری، سلائی کڑھائی یا کوئی دوسرا وسیلۂ معاش تلاش کر لیتیں تو شاید کلثوم اپنی دیرینہ خواہشات کی قربانی دے کر مرد بیٹی نہ بنتی۔

کہانی کا دوسرا کردار ارشاد احمد جو ماں جیسی انمول ہستی، زیر تعلیم چھوٹی بہن اور بڑی بہن جس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اور بات بات پہ منہ میں انگارے ڈالتی ہے، کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس کی ان ساری کوتاہیوں اور خود غرضی کے پس پشت اس کی زن مریدی پوشیدہ ہے اور زن مریدی ایک نفسیاتی خلل ہے جو 'ایڈی پس الجھاؤ' کے تحت وجود میں آتا ہے۔

افسانہ 'زلیخا' میں انور نامی ایک امیر کبیر آدمی کا کردار ہے جو اپنے ملازم برکت کی بیوی (زلیخا) سے ناجائز تعلقات رکھتا ہے۔ آج زچگی میں وہ انور کے بچے کو جن رہی ہے کیونکہ برکت کی شادی کو چار سال ہو چکے ہیں لیکن وہ تا حال اولاد سے محروم ہے۔ ان چار سالوں میں وہ اپنی مردانہ طاقت میں اضافہ کے لیے سیروں فولاد اور کشتہ فولاد کھاتا ہے لیکن بے سُود۔ دراصل برکت نفسیاتی طور پر جنسی بیماری نامردی میں مبتلا تھا جبکہ جنسی بیماریاں اکثر محرومیوں اور غلط تصورات سے پھوٹتی ہیں۔ رئیس امروہوی لکھتے ہیں:

> "جہاں تک جنسی امراض کا تعلق ہے تو وہ بیشتر خیالی، قیاسی اور فرضی ہوا کرتے ہیں۔ ایک آدمی کسی غلط تعلیم یا گمراہ کن ترغیب کے سبب یہ فرض کر لیتا ہے کہ وہ جنسی عمل پر قادر نہیں۔ پھر وہ لاشعوری طور پر یہی ترغیب دہراتا رہتا ہے اور آخر میں غلط اور بے بنیاد تصور ایک گرہ کی طرح اس کے ذہن کو جکڑ لیتا ہے۔"(۵)

ایک جانب برکت اپنی نفسیاتی جنسی بیماری کی وجہ سے بچہ پیدا کرنے سے رہا اور دوسری جانب 'زلیخا' کئی محرومیوں، جن میں اولاد، پیٹ اور

دولت کی بھوک اور جنسی تشنگی کو اولیت حاصل ہے، میں مبتلا تھی اور انور کو ایسے ہی موقع اور صورت حال کی تلاش تھی۔ اسی موقع کا ثمر تھا کہ آج زلیخا بچہ جَن رہی ہے اور نومولود جنم لیتے ہی مر جاتا ہے اور انور زار و قطار رونے لگتا ہے۔ اس کا دوست سجاد اس سے رونے کا سبب دریافت کرتا ہے تو وہ کہتا ہے:

"یہ بچہ جو مر گیا ہے نا یہ برکت کا نہیں تھا۔۔۔ تو پھر کس کا تھا؟ سجاد پوچھتا ہے۔۔۔ انور اپنا سر سجاد کے کندھے پر رکھ کر کہتا ہے، یہ صرف زلیخا جانتی ہے۔"(۶)

دراصل یہ بچہ انور اور زلیخا کی ناجائز اولاد تھی۔ کہانی میں انور جیسے رئیس آدمی کی جنسی خواہشات کی ناجائز طریقے سے سیرابی کا پول کھولا گیا ہے۔ ایسے ہی لوگوں اپنے گھروں کی نوکرانیوں کا جنسی استحصال کرتے ہیں اور افلاس اور فاقوں سے مغلوب یہ عورتیں سماج پر ناجائز اولاد کا بار ڈالتی رہتی ہیں۔ کچھ بچے زلیخا کے بچہ کی طرح جنم لیتے ہی مر جاتے ہیں یا انھیں مار دیا جاتا ہے لیکن ایسے بچے زیادہ تر ویرانوں، کچرے کے ڈھیر اور ندی نالوں کی زینت بنتے ہیں۔ شاید اس سے بڑا انسانیت سوز فعل کہیں نہ ہو۔

افسانہ 'دور بین' میں افسانہ نگار یہ دکھانا چاہتا ہے کہ شہروں میں اکثر محبت جیسے شیریں جذبوں اور رشتوں کی بھی توقیر نہیں ہوتی۔ انہیں بھی مادہ پرستی، خود غرضی، انا پرستی اور طبقاتی تضادات کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

رؤف اور مہتاب کالج کے طالب علم اور ایک دوسرے کے ساتھ بلکہ ایک دوسرے سے محبت کے دعویدار ہیں۔ رؤف محبت میں انا پرست ہے تو مہتاب انتہا پسند ہے۔ رؤف رئیس باپ کا اکلوتا لڑکا ہے جبکہ مہتاب ایک بوڑھے اور غریب باپ کی مفلس لڑکی ہے۔ رؤف اپنی امارت کی وجہ سے اعلیٰ سماجی مقام رکھتا ہے۔ اسی لیے وہ نفسیاتی طور پر خبطِ عظمت میں مبتلا ہے جبکہ مہتاب کی بے پناہ محرومیاں اور کمیاں ہیں اسی لیے وہ احساس کمتری میں مبتلا ہے۔ رؤف محبت کو دوستی کی حد تک رکھنا چاہتا ہے جبکہ مہتاب اپنے اندر کے خلا کو رؤف سے بھر دینا چاہتی ہے۔ اسی بھرنے کے عمل کے دوران وہ حسد اور انتہا پسندی کے گرداب میں پھنس جاتی ہے۔ وہ رؤف کی ذات اور اس کی تمام حرکات و سکنات کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لانا چاہتی ہے جبکہ محبت کلی آزادی کا تصور پیش کرتی ہے۔ اس حوالے سے اوشو لکھتا ہے:

"محبت میں کامل آزادی دینے کی صلاحیت ہے۔ صرف محبت کامل اور بھرپور آزادی دے سکتی ہے۔ اگرچہ محبت آزاد نہیں کرتی تو یہ محبت نہیں کچھ اور ہے۔ یہ آپ کی انا کا بچھایا ہوا جال ہے۔"(۷)

مہتاب کی محبت میں گرفت اور زنجیریں تو ہیں لیکن ساتھ میں وہ رؤف کو ٹوٹ کر چاہتی بھی تو ہے جبکہ دوسری طرف رؤف کی محبت میں ایسی شدت اور وارفتگی نہیں۔ اسی لیے وہ اتنی بڑی اور بھاری بات آسانی سے کہہ دیتا ہے:

"امی اور ابّا، دونوں سے ایک بار نہیں، کئی بار کہہ دیکھا ہے لیکن وہ نہیں مانتے۔"(۸)

مندرجہ بالا جملے میں رؤف کی سطحی محبت اور دوستانہ رویہ آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے اور ایک خط میں تو وہ کھل کر سامنے آجاتا ہے جب وہ اپنے باپ کے خیالات بلکہ فیصلہ، مہتاب کو پہنچاتا ہے:

"مہتاب پڑھی لکھی سہی مگر اس کے ابّا نے چھوٹے سے منیاری کی حیثیت سے تو کاروبار شروع کیا تھا اور لوگ کیا کہیں گے کہ رانا عرفان الٰہی کے اکلوتے بیٹے نے ایک منیاری کو گھر میں ڈال لیا ہے۔۔۔ اب سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ ہم میاں بیوی نہیں بن سکتے تو بھی دوست ضرور ہیں۔"(۹)

یہاں وثوق کی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ یہ الفاظ اس کے باپ کے نہیں بلکہ اس کے اپنے ہیں۔ اگر اپنے نہیں ہیں تو کیا وہ ایسا کہہ سکتا ہے؟ کیونکہ اسی باپ کی نگرانی میں وہ پلا بڑھا ہے۔ نفسیاتی طور پر بچے کا پہلا آئیڈیل اس کا باپ ہوتا ہے۔ وہ باپ جیسا بننا اور برتاؤ کرنا پسند کرتا ہے۔ اس

لیے یہ بات بعید نہیں کہ مہتاب کی محبت اور غربت کا یہ مذاق باپ نے نہیں، اس نے خود اڑایا ہو۔

اس تمام تر بحث سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شہر کے رئیس اور سرمایہ دار لوگ محبت کو یک وقتی خط کے سوا کچھ نہیں سمجھتے اور رؤف جیسے خبطِ عظمت میں مبتلا کردار ہی محبت کے نام پہ دھبہ ہوتے ہیں۔ ان ہی جیسے ہوس پرستوں کی بدولت محبت عدم اعتماد کا شکار ہوتی ہے اور سماج میں رشتوں اور بھروسوں کا فقدان جنم لیتا ہے جس سے تنہائیاں، نفرتیں، خودکشیاں اور کدورتیں پیدا ہوتی ہیں اور نتیجتاً معاشرہ انتشار اور بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ رؤف کی بے وفائی پر مہتاب کے دل میں بھی پہلا تصور خودکشی کا ہی آیا تھا۔

اسی طرح افسانہ 'گھر سے گھر تک' قیامِ پاکستان کے بعد نو آبادیاتی نظام میں سب سے رُلنے اور پِسے جانے والے طبقے یعنی متوسط طبقے کا نوحہ ہے۔ اشیائے خوردنی کی کمی اور مصنوعی مہنگائی نے مذکورہ طبقے کو تنگی کا ناچ نچایا تھا۔ وہ جہاں اپنے ان دگرگوں حالات پر افسردہ اور فریادی بنا ہوا تھا، وہاں وہ اس کم مائیگی کا شکار بھی تھا کہ کچھ گنے چنے لوگ تو عیش و عشرت اور لطائف میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس نعمتوں اور آسائشوں کی بہتات ہے اور ان کے گھر کسی بڑے مال سٹور کے شوکیسوں جیسے پُرکشش ہیں اور ہمارے گھر ویران اور ڈھنڈار ہیں۔

قاسمی اسی متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے دو خاندانوں کی محرومیاں، دغابازیاں اور بے جا نمود و نمائش کا پول کھول رہا ہے اور یہ بتانے کی سعی کر رہا ہے کہ ہر چیز میں ملاوٹ اور منافقت تو ہے ہی لیکن بدقسمتی سے رشتوں میں بھی مذکورہ برائیاں در آئی ہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ تو بڑا احساس، مقدس، مستحکم اور اعتماد سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس کی بنیادوں میں اگر جھوٹ، ملاوٹ، فریب، بے جا نمود و نمائش اور منافقت کا مسالہ ڈالا جائے تو ایسے رشتے پہلے بنیں گے نہیں، اگر بن گئے تو زیادہ دیر تک چلیں گے نہیں۔

شہروں میں اکثر 'کھودا پہاڑ، نکلا چوہا' کے مصداق لین دین اور تعلقات پائے جاتے ہیں جیسا کہ کہانی میں دکھایا گیا ہے۔ عشرت خانم مانگے کی بڑی کار میں نورالنساء کے گھر رشتہ لینے آئی ہے اور نورالنساء نے اپنا حقیقی غریب خانہ ادھار کے قالینوں، غالیچوں، صوفوں اور ڈیکوریشن کی چیزوں سے امارت خانہ میں تبدیل کیا ہوا ہوتا ہے اور جب آپس میں مل بیٹھتے ہیں تو عشرت خانم اپنے شوہر کی عدن میں بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے کاروبار، ان کی بے پناہ سخاوت اور اپنی شاہانہ زندگی کو شاہانہ انداز میں بیان کرتی ہے اور نورالنساء اپنی امارت کے قصے چٹخارے لے لے کر بیان کرتی ہے۔ یہاں جھوٹ، منافقت اور مکاری کو رشتوں کے اندر سمونے کی کوشش کی جارہی ہے۔

افسانے میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ انسان اپنی غرض اور سکون کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت چھپاتا ہے، اپنی کوتاہیوں، محرومیوں اور مفلسی کو چھپاتا ہے۔ اپنی بزدلی اور خوف خارج میں نہیں لاتا بلکہ جگہ جگہ اپنی بہادری کے جھوٹے قصے بیان کرتا ہے۔ مفلس ہے تو خارج میں اپنی امارت اور سخاوت کی کہانیاں بیان کرتے نہیں تھکتا۔ نااہل اور کمزور ہے تو ہر جگہ اپنی اہلیت اور کامل شخصیت کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ باطن میں گناہوں کی غلاظت کی سیاہی ہے تو خارج میں متقی اور پارسائی میں کوئی مقابل نہیں۔ غرض ہزار جھوٹے اور خوشنما ملمع چڑھا کر اپنی اصلیت اور حقیقت چھپانے کی سعی کرتا ہے۔ انسان کی ایسی ملمع کاری کی وجہ سے دھوکہ، فریب، جھوٹ، بے جا نمود و نمائش اور منافقت جیسی قباحتیں پروان چڑھتی ہیں اور مذکورہ برائیاں سماج میں پھیلتی جاتی ہیں۔ اس طرح عدم اعتماد کی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور انسان دوسرے انسان کے لیے نفرت اور دشمنی کا منبع بن جاتا ہے۔

افسانہ 'ھٰذا' میں فضل ربی' کی کہانی شہر کے چار جوان کرداروں فضل ربی، سجاد، شگفتہ اور تابندہ کے گرد گھومتی ہے۔ فضل ربی اپنے پڑوس کی دو لڑکیوں شگفتہ اور تابندہ سے ایک ہی وقت میں ایک ساتھ محبت، بلکہ محبت کا کھیل، کھیل رہا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کا دوست سجاد بھی انھیں دوشیزاؤں کی دلربائی اداؤں سے اپنی بہشت آباد کیے ہوا ہے۔ کہانی پر ترقی پسندی کی چھاپ نمایاں ہے کیونکہ مذکورہ چاروں کردار جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اگر اسے شہری سماج میں موجود آزادی اور ہوس پرستی کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ عقدہ کھلتا ہے کہ

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.1 2023

ہمارے شہروں میں محبت جیسا انمول جذبہ ہوس کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ فضل ربی اپنے دوست کو بتاتا ہے:

"شگفتہ کو میں صبح کے بعد اپنی کار میں گھماتا ہوں تو تابندہ شام سے پہلے مجھے اپنی کار میں گھماتی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ شگفتہ کو میری شاموں کا پتہ ہے اور تابندہ کو میری صبحوں کا۔ مجھے ان دونوں کی یہ معصومیت بڑی پیاری لگتی ہے۔"(۱۰)

محبت جس قربانی، وفاداری، اپنائیت اور سکون کا متلاشی ہے، وہ یہاں مفقود ہے۔ فضل ربی محبت کے لبادے میں اپنی جنسی خواہشات اور تمنائیں پوری کر رہا ہے۔ مذکورہ کردار تو شہری سماج کی نمائندگی کر رہا ہے ورنہ اکثر مرد اور عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں سب اس حمام میں ننگے ہیں۔ افسوس اس بات پر کہ ہر کوئی راضی برضا ہے۔ ہر ایک وقتی حظ کا متلاشی ہے۔ ہر ایک جسمانی لذتوں کا دلدادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محبت اور اس کے رشتوں میں مٹھاس، وفاداری اور پائیداری، نام کی بھی موجود نہیں۔

افسانہ 'بندگی وبے چارگی' میں شہری ماحول کی پراگندگی کے ساتھ ساتھ سرکاری و نجی دفاتر کی بدعنوانیوں و رشوت خوری کا پول کھولا گیا ہے اور اس کائناتی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان چاہے کتنا ہی شریف النفس اور متقی کیوں نہ ہو، اگر اس کا ماحول کرپشن، رشت، منافقت، ظلم، مادہ پرستی، استحصال، عیاشیوں، ناانصافی، شراب نوشی اور ہوس پرستی میں مبتلا ہے تو وہ ان سے اٹھنے والے غلیظ چھینٹوں سے اپنا دامن دیر تک نہیں بچا پائے گا۔

کہانی میں قاسمی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ گاؤں کے پاکیزہ اور معصوم ماحول میں پلا بڑھا شخص جب شہر کی رنگینیوں اور مادی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو جلد یا بہ دیر وہ اپنا تقدس اور معصومیت کھو بیٹھتا ہے۔ اس افسانے میں امین، جو گاؤں کا پروردہ ہے، کو شہر میں ملازمت مل جاتی ہے۔ اپنے گاؤں کی ایک خوبرو دوشیزہ بانو سے شادی کر کے اسے شہر لے آتا ہے اور سات پردوں میں مقید کر لیتا ہے۔ وہ اپنی بانو کی آنکھوں، چہرہ، ہاتھوں اور پیروں تک کو سیاہ رنگ کے ریشمی برقع میں ڈھانپ لیتا ہے۔ وہ بانو کے ہاتھوں پر لگی مہندی کی مہک کو کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتا تھا۔ اگر بانو کے کپڑوں پر لگا سلمیٰ ستارہ دھاگے سے آزاد ہو کر گر جاتا تو اسے دیوانہ وار زمین سے اٹھا کر یوں مٹھی میں دبوچ کر محفوظ کر لیتا جیسے کوئی نایاب ہیرا ہو۔

شہر میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد وہ شہر کے رنگ میں مکمل طور پر رنگ جاتا ہے لیکن ابھی اس کا ضمیر سلامت ہے۔ دوسرے دفتری کارندوں کی مانند ترقی اور مراعات کے لیے بیوی، بیٹی اور بہنوں کا سودا نہیں کیا لیکن کب تک خود کو محفوظ رکھتا۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کا ماتحت اس سے آگے نکل گیا، جب وہ دیکھتا کہ ایک جونیئر ملازم نے اپنی نئی نویلی بیوی کو ترقی کے لیے استعمال کیا تو وہ جیسے جل بھن کر رہ جاتا۔ اسی طرح جب وہ اپنے ماتحتوں کا ماتحت ہوتا چلا گیا تو اس نے خود کو زہر کے اس گھونٹ کو خلق کے پار لے جانے کے لیے تیار کر لیا اور اعلیٰ کرسیوں پر براجمان افسروں کو شراب کی پارٹی کے لیے مدعو کر لیا۔ پارٹی کی رات جب سارے افسران شراب کے نشے میں دھت لڑکھڑانے لگے تو امین انہیں اپنی بیوی کے کمرے میں لے جا کر کہتا ہے:

"یہ ہماری بیگم ہیں۔ یہ مسز امین ہیں۔۔۔ پھر اس نے مہمانوں کی طرف یوں دیکھا جیسے مداری ٹوپی میں سے کبوتر نکالنے سے پہلے تماشائیوں کو دیکھتا ہے۔۔۔ دوپٹہ کھینچنے سے بانو کے لمبے بال اس کے چہرے پر پھیل گئے تھے۔۔۔ ایکسکیوز می ڈارلنگ! میں شادی کے بعد سے تم پر زبردستی کر رہا ہوں۔ میں اس زبردستی کی معافی مانگتا ہوں۔۔۔ آج سے تمہارا پردہ ختم۔ بائی گاڈ آج سے، ابھی سے ختم۔۔۔ وہ رونے لگا اور ہنسنے لگا اور کہنے لگا: اسی خوشی میں، میں نے شراب پی ہے، تم بھی شراب پیو، بیرے کو بھی پلاؤ۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.1 2023

ساری دنیا کو پلاؤ۔ میرے افسروں سے ہاتھ ملاؤ، میرے افسروں کو لڈی دکھاؤ۔ میرے افسروں کو خوش کر و بانیاڈارلنگ۔"(۱۱)

اپنی بانوں سے بے پناہ محبت کرنے والا امین، دنیا کی حریص نظروں سے اسے کالے ریشمی برقع میں ڈھانپنے والا شوہر، خود اسے غیروں کی نظروں کے سامنے بے پردہ کر رہا ہے اور غیروں کی بانہوں کی زینت بنا رہا ہے۔ امین کو دلالی کے اس مقام تک پہنچانے میں اس کا ماحول اور حالات بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے افسروں اور دفتری ارکان نے شعوری طور پر بلکہ منصوبہ بندی کر کے ایسا ماحول پیدا کیا کہ امین خود ہی اپنی بیوی ان کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔

بد قسمتی سے قیام پاکستان سے لے کر اب تک انھیں سازشوں، کرپشن، رشوت خوری، منصوبہ بندی اور خوشنودیوں سے اعلیٰ کرسیوں اور اقتدار تک رسائی کو ممکن بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی پاکستان کی ان بدعنوانیوں اور محلاتی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جو لوگ اچانک صاحب اقتدار ہو گئے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت ان کے ہاتھ نکل کر دوسروں کے پاس جائے اس لیے انہوں نے جمہوری اداروں اور روایات کو یہاں جڑ نہیں پکڑنے دی اور سازشوں کے ذریعے اپنے اقتدار کو طول دیتے رہے۔ غلام محمد (گورنر جنرل) نے اسی طرح کی سازشی ذہن کے تحت اسمبلی توڑ دی، وزیر اعظم کو ہٹایا اور اپنی پسند کے لوگوں کو اعلیٰ عہدے دیے ۔۔۔ غلام محمد کو اسکندر مرزا نے سازش کر کے ہٹایا۔ اسے ایوب خان نے فوجی سازش کر کے جلاوطن کیا۔ ایوب خان، بھٹو کی سازش کا شکار ہوئے۔ بھٹو، ضیاء الحق کے دام میں گرفتار ہوئے اور پھر آٹھویں ترمیم سازش کے لیے استعمال ہوئی جس کے تحت دو مرتبہ بے نظیر اور ایک مرتبہ نواز شریف اقتدار سے محروم ہوئے اور یہ سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا بلکہ سازش اور سازشوں کی تہوں میں آج بھی اقتدار کی جنگ جاری ہے۔"(۱۲)

یہ کہانی ہمارے ملک کے ہر ایک ادارے کی کہانی ہے۔ جب اعلیٰ سطح پر سازشیں، کرپشن، منافقت اور لوٹ کھسوٹ جاری ہو تو نچلی سطح پر مذکورہ برائیوں کو شہ ملتی ہے۔ بد قسمتی سے جائز کاموں کو بھی ناجائز طریقوں سے کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے تو ہر سُو اشیائے خورونوش میں ملاوٹ، رشوت، جعلی ادویات، ناانصافیاں، اقربا پروری، بدعنوانیاں، ڈاکہ زنی اور منافقت عروج پر ہیں۔ ہر کوئی دوسروں کو لوٹنے کی ترکیبیں اور منصوبے ڈھونڈ رہا ہے۔ ہر کوئی اعلیٰ و ادنیٰ ملازمتوں کے حصول کے لیے بڑی بڑی سفارشوں اور رشوتوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ملازمت ملنے کے بعد بوس کی خوشنودی و چاپلوسی فرضِ عین ہے، ورنہ ترقی کبھی نصیب نہیں ہو گی بلکہ ہاتھ کی لکیروں سے ترقی کا لفظ مٹا دیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے عہدوں پر تقرری کے لیے قیمتی ساز و سامان (کار، بنگلہ، پلاٹ وغیرہ) کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر اور عزت کو بھی ان کے قدموں میں نچھاور کرنی پڑے گی۔ مذکورہ افسانے کا کردار امین انھیں حالات و واقعات کا قیدی تھا۔ ہزار جتن کرنے کے باوجود بھی وہ اپنے افسروں کے ساتھ ان کے حمام میں ننگا ہو ہی جاتا ہے۔

افسانہ 'فیشن' شہر کے ایک سرمایہ دار کی ایسی بیٹی کی کہانی ہے جو فیشن کی دلدادہ ہے۔

"ادھر فیشن بدلتا ادھر وہ نئے فیشن کے اکٹھے دس پندرہ جمپر سلوا لیتی۔ چار تو صرف اس کے برقعے تھے ۔۔۔ جوتے اتنے تھے کہ دو شیلفوں میں سے کتابیں نکال کر ان میں جوتے بھر دیے گئے تھے ۔۔۔ لپ اسٹک کے سب شیڈز اس کے پاس تھے۔ نیل پالش کی ہر مہک کی شیشیاں اس کی سنگار میز پر رہتی

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.1 2023

تھیں۔"(۱۳)

نجمہ کو فیشن کی آزادی تو تھی مگر گھر کی چار دیواری میں محبوس بھی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی اونچی آواز پر بھی پابندی تھی۔ اسے حلیمہ جیسی جوان اور حسین لڑکی، نوکرانی کے طور پر محض اس لیے دی گئی تھی تاکہ اس کا دل بہلا رہے۔ جب نجمہ کو اپنے پڑوسی شیخ منصور سے محبت ہو جاتی ہے تو حلیمہ ہی اس کا پیامبر بنتی ہے اور شیخ منصور ٹھہرا ایک لاابالی، دل پھینک اور جنس پرست شخص۔ اس نے حلیمہ (پیامبر) سے دوستی کی اور پیٹ سے بھاری کر دیا۔ بعد میں نجمہ کے ساتھ عشق و محبت کی شوخیاں کیں اور رفو چکر ہو گیا۔

شہری سماج کی اسی جنس پرستی اور دھوکہ دہی پر افسانہ 'حد فاضل' کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ حالات و واقعات ایک جیسے ہیں۔ مذکورہ افسانہ شاید اس کی ایک نئی صورت ہے۔ اس افسانے کے مرکزی باتوں میں پہلی بات یہ کہ بچے بچیوں پر کبھی اتنی زیادہ پابندیاں نہ لگائی جائیں کہ وہ چور راستے کے انتخاب پر مجبور ہو جائیں اور نجمہ کی مانند اپنی عزت داغدار کر دیں۔ دوسری یہ کہ گھر کی نوکرانیوں کو ہمیشہ اپنے حدود میں رکھنا چاہیے۔ ورنہ وہ خود کو مالکن تصور کر کے آپ کی چیزوں بلکہ آپ کی محبت پر بھی قابض ہو جاتی ہیں۔ تیسری بات یہ کہ شہری سماج کی دوستیاں اکثر فریب دیتی ہیں۔ ہر جگہ اعتماد کا فقدان ہوتا ہے۔ نجمہ نے حلیمہ کو بطور نوکرانی نہیں بلکہ دوست کے طور پر رکھا تھا۔ دونوں ایک جگہ کھانا کھاتیں اور ایک ہی چارپائی پہ ایک ساتھ سوتیں۔ اس بے پناہ محبت اور التفات کی بدولت حلیمہ اپنی محرومیوں اور احساس کمتریوں سے نکل آتی ہے اور اپنی ہی دوست اور مالکن کی محبت پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتی ہے۔ یقیناً اسی بے وفائی کے بدلے میں اسے بھاری پیٹ کا تحفہ ملا تھا۔ چوتھی بات یہ کہ شیخ منصور کی بے وفائی اور جنس پرستی کے حوالے سے ہے کہ وہ ایک بڑا کاروباری اور مالدار آدمی تھا۔ امارت کے ساتھ جاذب نظر اور پُرکشش شخصیت کا مالک بھی تھا۔ اسی امارت اور خوبصورتی کا فائدہ اٹھا کر وہ جوان اور معصوم زندگیوں سے کھیلتا تھا۔ لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھنسا کر جنسی حظ اٹھاتا تھا۔ شہر کا یہ کردار مکمل طور پر ایک جنس زدہ کردار ہے جس کے تمام رشتے، تعلقات اور افعال جنس پر ختم ہوتے ہیں۔

افسانہ 'سفید گھوڑا' میں قاسمی نے شہری سماج میں پائی جانے والی غلاظتوں جن میں طواءفیت طوائفیت، شراب نوشی، سفارشیں، رشوتیں اور بدعنوانیاں شامل ہیں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ افسانہ میں یہ بتانے کی سعی کی گئی ہے کہ ماحول ہی انسان کو نیک و بد بناتا ہے۔ رؤف جو شراب و کباب کو منہ تک نہیں لگاتا، اپنے دوست الیاس کی وجہ سے مذکورہ برائیوں کا رسیا ہو جاتا ہے۔ افسانے کا دوسرا حوالہ سرکاری دفاتر میں سفارشیں اور رشوتیں ہیں۔ اعلیٰ افسران اور مقتدر حلقہ رشوت کی صورت میں صرف گاڑی، بنگلہ، پلاٹ یا نقد رقم پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اکثر اوقات شراب و کباب کی دعوتیں بھی لوٹتے ہیں۔

افسانہ میں ایک ایسی ماں کا کردار ہے جو اپنی ہی جوان بیٹی سے عصمت فروشی کا مکروہ دھندہ کرواتی ہے۔ شاید ماں خود ماضی میں طوائف رہ چکی ہے یا ظالم سماج نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے یا شاید اپنے آلکسی پن کی وجہ سے محنت مزدوری کو ناپسند کرتی ہے اور یہ سہل راستہ اپنایا ہو۔ بہر حال اس کے اس نازیبا، مکروہ، غیر اخلاقی اور غیر مذہبی عمل کے کئی سماجی و نفسیاتی توجیہات ہو سکتی ہیں۔

"Must've been some rotting bastard of a parsi", Bansi lal said, Messed up my stomach. "well, are you okay now?" Musk Deer asked, "I'm getting better, Sahib", Bansi lal said, "I am weak, as I said, But I'll be able to go out in two or three days."

ترجمہ: بنسی کہنے لگا۔ کوئی حرام کا سڑیلا پارس ہوئیں گا۔ میرے پیٹ کا کباڑا کر دیا سالے نے۔ مشکی نے پوچھا، اب تو ٹھیک ہے نا تو۔ ہو، بروبر ٹھیک ہوئیلا ہے صاحب، ابی کم جوری ہے۔ دو تین روج میں نکلنے جوگا ہو جائیں گے صاب۔

اسد محمد خان نے انگریزی زبان پر عبور زمانۂ طالب علمی ہی حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے اور سکونت

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.1 2023

اختیار کی تو اس زمانے میں انھوں نے انگریزی ادب میں کراچی یونیورسٹی سے ماسٹر کرنے کے لیے داخلہ لیا مگر بد قسمتی سے مالی حالات نے مزید آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی اور ایم اے (سالِ اول) میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد پڑھائی ادھوری چھوڑ کر تلاشِ معاش کی فکر میں لگ گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس زمانے میں روسی ادب کا اچھا خاصا مطالعہ کیا اور کئی نامور ادیبوں اور ناول نگاروں کی تخلیقی شہکار کو اپنی بساط کے مطابق پڑھا اور سمجھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے روسی ادب سے انگریزی میں ترجمہ شدہ کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا جن میں 'دوبرینا' جسے روسی مصنف نجاد ابریشموچ نے تخلیق کیا ہے، کا کامیاب اردو ترجمہ کیا۔ اس طرح سلاوینکا دراکولیچ کی تحریر 'موت کا کلوز اپ' کا بھی اردو میں کامیاب ترجمہ کیا۔ مشہور روسی ادیب عرفان ہوروزووچ کی کہانی کا اردو میں 'بوسنیا کا بخار' کے نام سے ترجمہ کیا۔ اسی طرح ایک اور ادیب آئی وو آندرچ کی تحریر کا '۲ مئی ۱۹۴۲ء' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ اڑیسہ سے تعلق رکھنے والے ادیب منوج داس کی کہانی 'جنگل' کے نام سے ترجمہ کیا۔ ایک اور ہندوستانی ادیب دودھناتھ سنگھ کی ہندی زبان میں لکھی گئی تحریر کا 'کورس' کے نام سے کامیاب ترجمہ کیا۔ مشہور شہرۂ آفاق ادیب جولین بارنز کی تحریر کو 'ہملٹ وائلڈ ویسٹ میں' کے نام سے اردو میں ترجمہ کر کے اپنی ہنر مندی کا ثبوت دیا۔ الغرض انھوں نے ان تمام افسانوی تراجم میں حقیقت کا رنگ بھر کر اسے تخلیق کے قریب تر درجے پر فائز کر دیا ہے اور صحیح معنوں میں ان تراجم میں recreation کی روح سمو دی ہے۔ افسانہ 'سکوت و صدا' میں بتایا گیا ہے کہ شہروں میں اکثر خونی رشتوں سے کہیں زیادہ محبت دولت اور جائیداد سے ہوتی ہے بلکہ ہر نوع کے رشتے دولت و جائیداد کے حصول میں سیڑھیوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ماں اور بیٹا (یوسف) منصوبہ بناتے ہیں کہ تبسم، جو ایک بڑے سرمایہ دار کی بیٹی ہے، سے محبت کا ڈھونگ رچایا جائے اور شادی کے بعد اس سے پلاٹ، جائیداد اور رقم کے تقاضے شروع کریں گے لیکن تبسم اس مکارانہ چال سے اپنی سہیلی ثریا کی وفا شعاری کی وجہ سے بچ جاتی ہے۔ افسانہ 'عورت صاحبہ' میں شہری سماج کی بورژوا اور سرمایہ دار طبقے کی شراب نوشی، کلی آزادی اور منافقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کئی کارخانوں اور شراب کے کلبوں کا مالک سیٹھ نواز احمد ایک بہروپیہ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ سماج کے روبرو صوم و صلوٰۃ کی پابندی کا ڈھونگ رچاتا ہے اور خلوت میں نہ صرف خود شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے بلکہ اپنی جوان اولاد کو بھی شراب نوشی کی کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ اسی بے جا آزادی کی وجہ سے امتیاز کلب میں شراب پینے کے بعد 'عورت عورت' کہہ کر دوسروں کی بیویوں پر ڈورے ڈالتا ہے۔ انھیں بانہوں میں دبوچنے کی کوشش کرتا ہے۔ پورے افسانے میں شراب کی بُو سے بھرا تعفن زدہ ماحول ہے جہاں باپ اور بیٹے کے مابین عورت کے حسن، جنس اور شراب کے متعلق بے باک گفتگو ہے جہاں اخلاق، تہذیب، انسانی وقار اور رشتوں کے تقدس کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں۔

اسد محمد خان نے نا صرف ان زبانوں سے اردو میں تراجم کیے بلکہ خود اس کی اپنی تحریریں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتی رہی جن میں انگریزی، ہندی، گجراتی، پنجابی، مراٹھی اور دوسری مختلف زبانیں شامل ہیں۔ چنانچہ وہ خود اس سلسلے میں لکھتے ہیں: افسانہ 'بارٹر' اپنے موضوع اور کردار کے حوالے سے منفرد و عجیب افسانہ ہے۔ کہانی پر ترقی پسندی کی چھاپ کے ساتھ ساتھ منٹو کی چھاپ بھی نمایاں ہے۔ کہانی میں سرمایہ دار اور بورژوا طبقے سے تعلق رکھنے والا محمود، رخشی اور مختیار و نگینہ کی شراب نوشی اور مغربی طرزِ زندگی کا پول کھولا گیا ہے۔ مرد کردار تو ایک طرف، نوجوان لڑکیاں اور عورتیں منہ سے سگریٹ کا دھواں اور شراب کے بھبکے چھوڑ رہے ہیں۔

"Oxford University Press نے ۲۰۰۲ء میں اپنے سلسلے Pakistan Writers Series کے تحت چھٹی کتاب "The Harvest of Anger & other stories" شائع کی، جو میری ۱۲ کہانیوں کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے اسی ادارے نے آصف فرخی کی مرتب کردہ ایک انتھولجی "Fires in an Autumn Garden" کے عنوان سے شائع کی تھی، جس میں میری ایک کہانی کا ترجمہ شامل کیا گیا تھا۔"(۹)

مشہور ادیب Mark Twein's کی مشہور short story 'A War Prayer' کا اردو میں 'دعائے جنگ' کے عنوان سے کامیاب

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.1 2023

ترجمہ کیا اور ترجمے میں تخلیقی روح بھر دی۔ 'A War Prayer' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس کا ترجمہ انھوں نے 'دعائے جنگ' کے نام سے کیا ہے۔ محمود اور رخشی عاشق و معشوق ہیں اور مختیار و نگینہ نے حال ہی میں شادی کی ہے۔ دونوں جوڑے عجیب اور بے ڈھنگا سا بہانہ بنا کر ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ کر لیتے ہیں یعنی محمود اپنی محبوبہ مختیار کو اور مختیار اپنی بیوی محمود کے حوالہ کر دیتا ہے۔ پھر کچھ دنوں بعد کسی ہوٹل میں اتفاقاً ملاقات ہونے پر اپنی اپنی لڑکی واپس لیتے ہیں۔ اسی طرح مغربی جنسی اصطلاح میں swingers بنتے ہیں۔ کیا ہمارا مذہب، معاشرہ، اخلاق، روایات اور تہذیب اس کریہہ عمل کی اجازت دیتا ہے۔ دراصل یہ اور اس نوع کی دوسری غلاظتیں اور اخلاقی بے راہ روی بے دریغ دولت، شراب نوشی اور منشیات مغربی طرزِ زندگی کی دَین ہے۔ یہ چاروں کردار مغرب کے تعلیم یافتہ تھے اور بے پناہ دولت کے مالک تھے۔ یہ مشرقی شرم وحیا، مذہبی اور اخلاقی اصولوں اور تہذیب و روایات سے مکمل طور پر نابلد تھے۔ یہ صرف عیاشیاں اور عیاشیوں کے لیے نت نئے طریقے اور راستے بنانا جانتے تھے۔ ایسے ہی بے باک اور ہٹ دھرم کرداروں کی وجہ سے معاشرے میں رشتوں کا تقدس پامال ہوتا ہے اور انار کی وہوس پرستی کو تقویت ملتی ہے۔ افسانہ 'مجبور' پر بھی ترقی پسندی کی چھاپ سے کہیں زیادہ منٹو کے اسلوب و موضوع و چھاپ ہے۔ افسانے میں شراب کی پارٹی کی بڑی بے حیا اور شرم سے عاری تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ راجہ عامر بیگ جو اربوں کا مالک ہے جس کا کاروبار ملک و بیرون ملک پھیلا ہوا ہے۔ شراب و کباب اس کے محبوب مشاغل ہیں۔ وہ جس ملک اور جگہ جاتا ہے وہاں اس کے کاروبار سے متعلق کارندے اس کے ان مشاغل کی بجا آوری کے لیے اپنی بیٹیاں اور بہوئیں پیش کرتے ہیں۔ اگر کسی کی بہو بیٹی نہیں تو وہ اپنی بیوی اس کی خدمت میں پیش کرتا ہے جو بے غیرتی، کمینگی اور دلالی کی انتہا ہے۔ اس طبقے کو صرف نوٹ کی مہک عزیز ہے، باقی اس کے ضمیر اور بیوی بیٹی کی مہک جاتی اور لٹنے کی کوئی پرواہ نہیں۔

"There young faces a light with martial dreams. Visions of the stern advance, the gathering momentum, the Rushing Charge, the flashing sabers, the flight of the foe, the tumult, the enveloping smoke, the fierce pursuit the surrender them home from the war, Bronze heroes welcomed, adored, submerged in golden seas of glory."

ترجمہ: ان کے چہرے حقیقت کے رنگوں میں رنگے ہوئے خوابوں سے روشن تھے جن میں سخت پیش قدمی اور رفتار پکڑتی، لپکتی یلغار اور لشکتی شمشیروں کی تصویریں تھیں اور شور و غوغا کے اور غنیم کے سپاہیوں، گھیرے ہوئے دھویں اور غضب ناک تعاقب سے لے کر ہتھیار ڈالنے تک کے زندہ مناظر تھے۔ ان خوابوں میں میدانِ جنگ سے گھر لوٹتے دلاوروں کے سنولائے ہوئے چہرے تھے کہ جن کے سواگت میں خوب جے جے کار ہوئی تھی، جنھیں خوب سراہا گیا تھا، جنھیں عظمت واقبال مندی کے سنہرے سیلاب میں گلے گلے ڈبو دیا گیا تھا۔(دعائے جنگ)

اسد محمد خان نے ایک ماہر مترجم کی طرح دونوں زبانوں یعنی اصل زبان اور ترجمہ والی زبان کے آہنگ کو سنا، اور اسی کے مطابق اس کا ترجمہ کیا۔ ایک خلاق مترجم کی طرح انھوں نے جس زبان کے ادب سے بھی ترجمہ کیا، پہلے اس زبان کے ادب اور ادبی روایات سے پوری طرح واقفیت حاصل کی۔ یہی نہیں بلکہ اس میں اصل زبان کی تخلیق کو محسوس کرنے اور سوچنے پر قدرت حاصل ہے۔ اس خصوصیت کو 'مشکی ہرن' کے ترجمہ سے قارئین بخوبی محسوس کرسکتے ہیں۔ راجہ عامر بیگ شراب کی بدبو اور سگریٹ کے دھویں سے آلودہ ماحول میں بورژوا طبقے سے تعلق رکھنے والے مردوں اور عورتوں اور سب سے بڑھ کر اپنی جوان بیٹی لارا کی موجودگی میں اپنی جنسی رنگ رلیاں چٹخارے لے لے کر بیان کر رہا ہے۔

جہاں تک اسد محمد خان کے روسی افسانوں کے تراجم کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں وہ رابرٹ لاول 'Robert Lowel' اور آڈن 'Audin' کی طرح ہیں جو روسی نہیں جانتے تھے لیکن انھوں نے روسی سے انگریزی میں بعض عمدہ ترجمے کیے ہیں۔ اس سلسلے میں شمس الرحمان فاروقی اپنے مضمون 'دریافت اور بازیافت' میں لکھتے ہیں۔

”ہم صرف مادری زبان ہی میں خود کو پوری طرح غرق کر سکتے ہیں اور اس طرح غرق ہوئے بغیر زبان میں خلاقانہ فکر کو حاصل کرنا ممکن نہیں۔“(۱۰)"میں زمیا کی بات کر رہا تھا۔۔۔اس کے پاپا سے میرے بہت قریبی مراسم تھے۔اس کی ہر چیز میری تھی یعنی اس کی بیٹی تک۔۔۔لیزا جب سیدھی میری آغوش میں آ گری تو میں نے کہا، لیزا اوپر سے تمہارے پاپا آ گئے تو؟ تو وہ بولی، تو کیا میں پاپا کو بتا کر آئی ہوں بلکہ مجھے انہی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔۔۔اتنی پیاری بات پر میں نے اسے کِس کیا تو، کِس کو ختم کرنا ہی بھول گیا۔لیزا کے ساتھ میرا وقت بے مثال گزرا۔وہ دن رات میرے ساتھ رہی۔"(۱۴(

اسد محمد خان کے تراجم کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مغربی فکشن پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ان کے پاس ترجمہ کرنے کا تجربہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اردو کے لفظی اثاثے سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں اور لفظ تراشی کا خاص ملکہ رکھتے ہیں اور یہ سب باتیں تراجم کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔وہ انگریزی کے ادبی لفظیات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔اس سلسلے میں اردو کے مشہور نقاد حسن الدین احمد اپنے مضمون 'فنِ ترجمہ' میں لکھتا ہے:راجہ عامر بیگ ایک مردہ ضمیر کا شخص ہے جس نے پوری زندگی کلی آزادی، عیاشیوں اور مسرتوں کے ساتھ بسر کی ہے۔وہ اپنی جن جنسی عیاشیوں کا ذکر اپنی جوان بیٹی کی موجودگی میں کر رہا تھا، کیا اس کی بیٹی پر اس کے ہوشربا آزادانہ ماحول کا اثر نہیں ہو گا۔وہ دوسروں کے بیٹوں سے اپنی جنسی خواہشات پوری کر رہا ہے۔کیا اسے مکافات عمل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔اسی لیے تو بھری محفل میں مسٹر غوری نشے کی حالت میں لارا کو دبوچ کر دیوانہ وار اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دیتا ہے۔

”ترجمہ کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ صرف اصل عبارت کا درست لفظی ترجمہ ہو بلکہ مصنف کے نظریات، معتقدات، تصورات اور احساسات کی صحیح ترجمان بھی ہو۔“(۱۱(

اس تعریف کی روشنی میں اگر اسد محمد خان کے تراجم کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اصل تصنیف کے خالق کے نظریات اور احساسات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔وہ ایک ماہر مترجم کی طرح موضوع سے بھی گہری واقفیت رکھنے والے ادیب ہیں۔وہ اصل متن کے پس منظر سے پوری آگہی حاصل کرتے ہیں کیونکہ مترجم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ وہ بالطبع ذہین ہو اور اس نے اصل متن کی روح کو پا لیا ہو اور پھر اصل کو اپنے مزاج کے مطابق نیا قالب دینے پر قادر بھی ہو۔یہی وجہ ہے کہ ترجمہ میں تخلیق کو از سرِ نو پا لیا جاتا ہے۔وہ ان تمام باریک بینیوں سے نہ صرف اچھی طرح واقف ہیں بلکہ وہ ترجمہ کرتے وقت ان باتوں کا خیال بھی رکھتے ہیں۔'مشکی ہرن' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:افسانہ 'سیکرٹری' سفارشوں اور بدعنوانیوں سے پروان چڑھنے والی معاشرے کی کہانی ہے۔راؤ انور حاجت مند اور مجبور لوگوں سے بڑی بڑی رقمیں لے کر ان کی سفارشیں وزرا اور مقتدر طبقے تک پہنچاتا ہے۔اپنے اس کریہہ فعل میں اپنے ساتھ بے روزگار نوجوان ابراہیم کو دس فی صد معاوضے پر سیکرٹری رکھ لیتا ہے۔لاکھوں کمانے کے بعد راؤ انور بے یمانی پہ بے ایمانی کر کے حرام پہ حرام بٹورتا جاتا ہے۔افسانہ میں راؤ انور ایک علامت ہے ورنہ تقریباً پورا ملک اور ہر فرد انہی کرتوتوں، بے ایمانیوں، رشوتوں اور سفارشوں کے بل پر چلتا ہے۔ہمارے ملک میں رشوت اور کرپشن سرطان کی سی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔بدقسمتی یہ کہ جائز کام کو بھی رشوت دے کر کرنا پڑتا ہے۔رشوت کو ہر ایک اپنا حق سمجھ بیٹھا ہے۔ہر شخص لینے اور دینے کا عادی ہو چکا ہے۔لینے دینے کے اس چکر میں ہمیشہ نقصان ملک و قوم کا ہی ہوتا ہے۔حکومت، قوم کے ترقیاتی منصوبوں اور فلاح و بہبود پر کام نہیں کر سکتی۔ملکی معیشت اور افراد کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔نئے نظریات، نئے افکار اور انقلابات آنا بند ہو جاتے ہیں اور جسمانی توانائیاں زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے ہاں کچھ کردار ایسے بھی ہیں جو شہر کی مادہ پرستی، جھوٹ، مکاری، جنس پرستی اور فریب وغیرہ جیسی غلاظتوں کے ساتھ گاؤں کے ماحول میں وارد ہوتے ہیں اور اپنے ناپاک عزائم کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کرتے ہیں۔افسانہ 'حق بجانب' میں شہری سماج کا پروردہ انور،

گاؤں کی ایک دوشیزہ سے محبت کا ڈھونگ رچا کر جسمانی لذتیں تو لیتا ہے مگر جب لڑکی کو اس کی بے وفائی کا علم ہو جاتا ہے تو اسے قتل کر دیتی ہے۔ یہاں محبت اور انا پرستی میں انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ شہر کے لونڈے کی بے وفائی، وقتی محبت، جنس پرستی اور گاؤں کی لڑکی کی غیرت سامنے لائی گئی ہے۔

"At a railway station Musk Deer saw a man in a dark suit, wearing dark glasses. On Bose road, he saw a taxicab with its wood opened like a jaw, and the cabman peering into it. He saw an old man at a crossing waiting for the lights to turn green, who looked as he had been waiting forever."

ترجمہ: کسی ریلوے اسٹیشن پر مشکی ہرن کو گہرے رنگ کا سوٹ پہنے اور کالا چشمہ لگائے ایک آدمی نظر آیا۔ بوس روڈ پر اس نے ٹیکسی دیکھی جس کا بڈ جبڑوں کی طرح کھلا ہوا تھا اور ٹیکسی والا اس میں سر ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے کراسنگ پر ایک بڈھا دیکھا جو ٹریفک لائٹ کے سبز ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ لگتا تھا بڈھا ہمیشہ سے اسی طرح انتظار کر رہا ہے۔ افسانہ 'سپنوں کا محل' میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے گاؤں کی ایک خوبصورت دوشیزہ کے خوابوں اور خواہشات کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ لیکن اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کی سادگی، معصومیت اور محبت کا فائدہ اٹھا کر اس کے جسم تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لڑکی اس کی دی ہوئی رقم کے تقاضے کو بھانپ لیتی ہے اور اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ لیکن 'طلوع و غروب' کی نرگس سپنوں کا محل کے کردار کی طرح شہری لونڈے سے اپنی عصمت بچا نہ سکی۔ غضنفر اس کی خواہشات کا فائدہ اٹھا کر اس کے جسم کے سارے نشے لوٹ کر شہر چلا جاتا ہے اور ادھر نرگس پوری طرح لٹنے کے بعد خودکشی کے مقابلے میں جسم فروشی کو منتخب کر لیتی ہے۔

اس اقتباس میں چھوٹے چھوٹے جزئیات کے ذریعے افسانہ نگار نے صرف کسی منظر کا نقشہ نہیں کھینچا ہے بلکہ اس نے پورے شہر کو آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح پردے پر گزرتے ہوئے دکھایا ہے۔ افسانہ 'عبدالمتین ایم اے' میں عبدالمتین ایم اے کرنے کے بعد گاؤں کی زندگی میں اصلاحات اور ترقی لانے کی غرض سے کسی گاؤں کا رخ کرتا ہے۔ گاؤں والوں کو مختلف کاموں اور منصوبوں پر لگا کر خود چھوٹی لڑکیوں کے لیے مکتب کھول لیتا ہے۔ اگلے دن چٹکتی کلیوں سے بوسہ لینے کی خبر جب گاؤں والوں کو پہنچتی ہے تو وہ وہاں سے کسی طرح جان بچا کر بھاگ جاتا ہے۔

افسا

ایک زبان کے تخلیقی ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرنا بڑا نازک اور دشوار کام ہے۔ ترجموں ہی کی بدولت کسی زبان کے ادیبوں کو نئے ادبی اقدار ملتے ہیں اور اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی مروجہ قدروں اور نئی قدروں میں کس قدر فرق ہے۔ اس طرح اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینے کا موقع بھی ملتا ہے۔ نہ 'رئیس خانہ' کی کہانی اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے موضوع اور کرداروں پر الگ سے ایک طویل مقالہ لکھا جا سکتا ہے کیونکہ افسانے کی مختلف پرتیں اور رُخ ہیں۔ یوسف نامی ایک رئیس شہری سکیسر کے ایک صحت افزا مقام کے ڈاک بنگلہ کے ملازم فضلو کی بیوی مریاں سے جنسی تسکین کے حصول کو اپنا مقصد ٹھہراتا ہے۔ یہ شخص اپنی بے پناہ نبض شناسی سے کام لے کر بڑی شاطرانہ چالوں اور نفسیاتی حربوں سے کام لیتا ہے اور آخر کار مریاں کے جسم کو ایک بھوکے کتے کی طرح نوچ نوچ کر رفوچکر ہو جاتا ہے۔

ترجمانی کے ذریعے مصنف کے خیالات کے نفسیاتی محرکات تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے یعنی قاری یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کون سا مسئلہ ہے جس نے مصنف کو متذکرہ متن تحریر کرنے کے لیے مجبور کیا۔ اس حوالے سے اسد محمد خان کے تراجم کا جائزہ لیا جائے تو قاری انتہائی آسانی سے مترجم کی ذہنی کیفیات تک پہنچ سکتا ہے۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قاسمی کے لیے شہر ہو یا دیہات جہاں انھیں انسان اور انسانیت کی تذلیل اور کم مائیگی نظر آئے وہاں ان کا قلم بے دھڑک چلنے لگتا ہے اور ان برائیوں کو قارئین کے سامنے پیش کرنے سے نہیں

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.1 2023

ہچکچاتے۔

ادبی تراجم میں نثری ادب کے بہت سے عمدہ ترجمے ہوئے ہیں۔ مشہور مترجمین میں مجنوں گورکھپوری، شاہد احمد دہلوی، عبدالمجید سالک، عزیز احمد، غلام عباس، اختر حسین رائے پوری، قاضی عبدالغفار کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان مترجمین نے، جو خود بھی اعلیٰ پائے کے ادیب تھے، نثری ادب کے بہت سے تسلی بخش ترجمے کیے ہیں اور اردو کے دامن کو مالامال کر دیا ہے۔

اسد محمد خان نے زیادہ تر بامحاورہ نثری تراجم کیے ہیں۔ نثری ترجمے میں اصل محاورے کی ترجمانی بھی اپنی جگہ ایک افادی پہلو رکھتی ہے۔ اگر ترجمے کی غرض وغایت ادبی و تخلیقی ہو تو یہ شرط اور زیادہ دشوار ہوتا ہے کیونکہ تخلیق میں تو فکر آزاد ہوتا ہے اور ترجمے کی صورت میں اصل کے ساتھ رشتہ بنائے رکھنا ہوتا ہے۔ وہ انتہائی آسانی سے اس مشکل مرحلے کو طے کرتا دکھائی دیتا ہے اور بالکل فطری انداز میں ترجمے کی روانی سے گزر کر تخلیق کی حدود میں قدم رکھتے ہیں یعنی وہ پابند ہونے کے باوجود بعض معاملوں میں بالکل آزاد ہے۔

مختصراً، اس بحث سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسد محمد خان نے جس طرح تخلیقی ادب میں نام پیدا کیا ہے اور کئی بہترین اور شہکار افسانے تخلیق کیے ہیں بالکل اسی طرح انھوں نے تراجم کرتے وقت نا صرف ایک ماہر مترجم کی طرح فن ترجمہ نگاری کے تمام اصولوں کو سامنے رکھ کر ادبی تراجم کیے بلکہ اس میں تخلیقی شان پیدا کر کے قاری کے لیے اسے دلچسپ اور پڑھنے کے قابل بنا دیا ہے۔ عالمی ادب اور خاص کر کلاسیکی ادب پر اس کی گہری نظر تھی اور یہ شعور اسے ترجمہ نگاری کی دنیا میں ایک کامیاب مترجم کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ ان کے ادبی تراجم کو یکجا کر کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بامحاورہ زبان استعمال کی ہے۔ روزمرہ، ضرب الامثال، تشبیہات، استعارات و کنایات اور رموز و علامات سے بھی کام لیا ہے، جس سے ترجمے میں خود بخود ایک ادبی رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور ترجمہ ایک طبع زاد تحریر معلوم ہونے لگتی ہے۔ بیان کے متین و شگفتہ اور متعدد پیرائے اردو میں موجود ہیں البتہ انھیں برتنے کے لیے مترجم کی علمی استعداد کی ضرورت بہر حال رہتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ معیاری ادب سے خوب واقفیت ہونی چاہیے۔ انھوں نے ہر کہانی کا ترجمہ کرتے وقت اس اصول کو مد نظر رکھا۔ اس نے ترجمہ کرتے وقت اس کو ملحوظ خاطر رکھا کہ کسی طرح بھی اصل متن کا چہرہ مسخ نہ ہو اور ترجمے کا پورا پورا حق بھی ادا ہو جائے۔ وہ بذاتِ خود ایک صاحبِ اسلوب ادیب ہے، اس لیے اس نے نہ صرف ترجمہ شدہ مواد کا مطالعہ کیا بلکہ قاری کے ذہن تک اس کی رسائی ممکن بنائی۔ ان کے کیے ہوئے تراجم کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس آہنگ اور مزاج کا خاص خیال رکھتے ہیں جو اصل متن میں موجود ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ زبان کی سلاست و روانی اور موضوع و مفہوم کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ابہام کا شبہ نہیں رہتا یعنی قاری کو ترجمہ پڑھتے وقت اصل کتاب کا مطالعہ کرنے کی خواہش نہیں ہوتی اور وہ مترجم کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اسد محمد خان کا مطالعہ انتہائی وسیع ہے اور اس خوبی نے بھی ان کے ترجموں میں ایک آفاقی شان پیدا کر دیا ہے۔ وہ ایک ماہر مترجم کی طرح اپنے اندازِ بیان، لب و لہجے، ذاتی عقل و شعور اور فہم و ادراک سے ایک نسبتاً کم مایہ تصنیف کو بھی بامِ عروج پر پہنچا دیتا ہے۔ وہ ایک اچھے اور مستند مترجم کی طرح وہی لفظ استعمال کرتا ہے جو موقع و محل کی مناسبت سے بالکل موزوں ہو اور ظاہر ہے کہ یہ بات تبھی ممکن ہو سکتی ہے جب مترجم کے زیرِ مطالعہ مختلف لغات رہی ہوں جس سے وہ حسبِ ضرورت اپنے مطلب کا لفظ چُن لیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"He saw a man sitting on top of an empty hand-cart. He saw a man leaving against a lamppost, reading a newspaper. He saw a small boy pressing hi nose against the glass of a show-window. He saw a man trying to light a cigarette, his back against the wind. He saw a film actor Dilip Kumar pass by in a Cadillac."

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.1 2023

ترجمہ: اس نے دیکھا خالی ہاتھ گاڑی پر ایک آدمی چڑھا ہوا بیٹھا ہے۔ ایک آدمی بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا اخبار پڑھ رہا تھا۔ دکان کے شیشے سے ناک بھڑائے ایک چھوٹا لڑکا اندر دیکھ رہا تھا۔ ہوا کے رُخ پشت کیے ایک شخص اپنی سگریٹ سلگانے کی کوشش میں تھا۔ اس نے ایکٹر دلیپ کمار کو اپنی کیڈلک کار میں گزرتے دیکھا۔(مشکی ہرن(

اس اقتباس میں مترجم کی ماہرانہ چابکدستی کو قاری محسوس کر سکتا ہے۔ جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ پوری تصویر قاری کی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ اسد محمد خان کے ان تراجم کو پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مترجم کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں بلکہ قاری اس کے برعکس مترجم کی قلم کی روانی اور آزادہ روی کو محسوس کر سکتا ہے۔ انھوں نے جہاں جہاں ضرورت محسوس کی وہاں وہاں وہ روانی کے ساتھ غیر محسوس انداز میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے ترجمے کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے اور تحریر کی ادبی شان بھی برقرار رہتی ہے۔

اسد محمد خان نے ابتدا میں غیر زبانوں سے افسانوں کے جو ترجمے کیے ہیں، وہ مختلف ادبی رسائل میں چھپتے رہے۔ بعد میں ان کے طبع زاد افسانوی مجموعوں میں چھپتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے بہت سے اردو کے تراجم پہلے پہل ان رسالوں اور ڈائجسٹوں میں چھپتے رہے۔ ان ڈائجسٹوں اور رسالوں نے افسانوں، کہانیوں کے تراجم کی رفتار تیز کر دی اور مختصر مدت میں مترجم نے افسانوں کا ایک بڑا ذخیرہ پیش کر دیا اور نئے ترجمہ نویسوں کو ادب کی دنیا میں متعارف کرا دیا۔ وہ ایک پختہ کار مترجم کی طرح ایک زبان کے ادب کو دوسری زبان کے ادب میں اسی مہارت سے منتقل کرتا ہے گویا وہ اس کی اپنی زبان میں لکھا گیا ہے۔ وہ ایک بااصول مترجم کی طرح کسی کہانی کے پلاٹ، کردار اور مرکزی کردار کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کا مجاز تو نہیں رکھتا مگر وہ ہنر مندانہ انداز سے حالات و واقعات کی کڑیاں اپنے ماحول میں جوڑتا اور مرتب کرتا ہے۔ ان کے ترجمہ شدہ افسانوں میں 'مشکی ہرن'، 'دعائے جنگ' اور 'لووینا' میں اس خصوصیت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اسد محمد خان اپنے تراجم میں بھاری بھرکم الفاظ و تراکیب سے بچنے کی شعوری سعی کرتا ہے کیونکہ ایسے الفاظ افسانے کی قدر و قیمت میں ادبی لحاظ سے تو اضافہ کر سکتے ہیں مگر عام قاری ہمیشہ ایسے موقعوں پر جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ بعض مترجمین کی طرح بے جا فلسفہ بھی شامل نہیں کرتا۔ وہ غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرتا ہے۔ انھوں نے جہاں اصل مصنف کی سوچ کی گھمبیرتا کو محسوس کیا ہے وہاں وہ مفہوم بھی سمجھ کر آسان لفظوں میں تحریر کرتا ہے۔ بعض مترجمین کی طرح وہ مکھی پر مکھی مارنے کا قائل نہیں کیونکہ اس سے روانی اور سلاست میں نہ صرف رکاوٹ پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کی سلاست بھی غارت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے دماغ سے فیصلہ کرتا ہے کہ کہاں کہاں تبدیلیاں کرنی ہیں اور اپنے فن کا مظاہرہ انھیں کب اور کس موقع پر کرنا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر قمر رئیس، ترجمہ کا فن اور روایت، دہلی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۶ء، ص ۹۱۔ اطہر رضوی، دریا سمندر سے جاملا، نذرِ ندیم، مونتاج، لاہور، ۲۰۰۷، ص ۴۹

۲۔ اعجاز راہی، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۸

۳۔ نثار احمد قریشی، ترجمہ: روایت اور فن، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ا

۴۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۰

۵۔ صفدر رشید، فنِ ترجمہ کاری، مباحث، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱

۶۔ عقیلہ اسماعیل، جمالیاتی ذوق کا امین مشمولہ رسالہ چہار سو، جلد ۱۷، شمارہ جنوری فروری ۲۰۰۸ء، ص ۲۵

۷۔ اسد محمد خان، جو کہانیاں لکھیں، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۶ء، ص ۶۹۳

۸۔ اسد محمد خان کی ادبی خدمات، پی ایچ ڈی مقالہ، عبد الرحمان، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۱۶ء، ص ۴۰۳

۹۔ اسد محمد خان، رسالہ چہار سو، جلد ۱۷، شمارہ جنوری فروری، ۲۰۰۸ء، ص ۵

۱۰۔ شمس الرحمان فاروقی، دریافت اور بازیافت مشمولہ فنِ ترجمہ کاری، مرتب: صفدر رشید، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء، ص ۴۰

۱۱۔ حسن الدین احمد، فنِ ترجمہ، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء، ص ۵۲۔۷ وجاہت مسعود، ابر بہار چل دیا، سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۴۵

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، عورت جنس اور جذبات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۴۳۔۱۴۲

۴۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۷

۵۔ رئیس امروہوی، جنسیات، ویلکم بک پورٹ، ۲۰۱۳ء، ص ۵۸۔۲۵۷

۶۔ احمد ندیم قاسمی، بازار حیات، اساطیر، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۸۳

۷۔ گرو جنبش (اوشو) ترجمہ عقیل عباس سومرو، نیا دور۔۔۔ نیا انسان، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲۰

۸۔ احمد ندیم قاسمی، برگ حنا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۵۶

۹۔ ایضاً

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۳۲

۱۱۔ ایضاً، ۶۱۔۱۶۰

۱۲۔ ڈاکٹر مبارک علی، تاریخ اور معاشرہ، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۹۸

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ۳۰۔۲۹

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، پت جھڑ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۳۷۔۳۶